موسیو سدیو کی تاریخِ عرب پر ایک نظر

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری

ایم اے، ایل ایل بی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحاناتِ عربی و فارسی اتر پردیش

مبحثِ اوّل

(عربوں کے تحصیلِ علوم کی ابتداء اور خلیفہ منصور عباسی کی خلافت کا آغاز)

یہ فخر عرب خلفاء کے زمرہ میں ابو جعفر المنصور عباسی کو حاصل ہے کہ اُس نے سب سے پہلے عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل میں مشغول کیا اس کی دلیل یہ ہے کہ قدماء عرب کی کتابوں میں بجز بعض ایسے فوائد کے جن کا تعلق عملیاتِ فلکیہ سے ہے اور کوئی علمی مسئلہ نظر نہیں آتا۔ یہ چند فلکی عملیات بھی عربوں کو آسمانی منظر کے وسیلے سے حاصل ہوئے تھے، کیوں کہ منظرِ فلک نے ان کے ذہنوں کو اپنی طرف جذب کر کے اس بات پر غور و فکر کرنے کی توجہ دلائی کہ آخر اس چادرِ نیلی میں یہ تاباں و درخشاں اَجرام کیوں پائے جاتے ہیں، یہ ایک فطری احساس ہے اور دنیا کی تمام قوموں کو ہوا اور ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممالک کی خوبی اور درستیِ آب و ہوا کی حالت میں کواکب اور نجوم کے مشاہدہ اور رصد کی طرف متوجہ اور مائل ہوں۔

قدماءِ عرب منازلِ قمر اور نجومِ فلکیہ کے احکام سے واقف و آگاہ تھے۔ ان کو سیارکواکب اور بعض دیگر روشن و درخشاں ستاروں کا بھی علم تھا۔ ان ستاروں کو وہ بخوبی پہچانتے تھے، بلکہ ماسوی اللہ اُن کی عبادت بھی کرتے تھے۔ اُن کے ہاں حسابِ سنین میں قمری یعنی چاند کے مہینوں کا حساب رائج تھا۔ مگر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اُنھوں نے کبھی یہ فکر کی ہو کہ آسمان کی حرکتوں کی کوئی حد مقرر کریں، یا کوئی ایسا سنہ اور تاریخ قرار دیں جو اُن تمام قوموں میں یکساں رواج پا جائے۔ چنانچہ کسی عام تاریخ یا شمارِ سنین کا حساب نہ ہونے کی وجہ سے تاریخِ عرب کے سلسلہ کی سال وار ترتیب قبل از اسلام تک بالکل محال ہے۔ اور جب تک اُن کے مختلف طریقے کی عبادتیں منسوخ ہو کر انہیں بالکلیہ

اسلام کی تبعیت نصیب نہیں ہوئی، اُس وقت تک اُن کا کوئی مسلسل سنہ قائم نہ ہو سکا۔

مگر عربوں کی طبیعت میں فطری جودت تھی اور اُن میں اس بات کی کامل استعداد موجود تھی کہ جو بات اُن کو کہیں سے حاصل ہو، اس سے تنہا خود ہی فائدہ نہ اُٹھائیں، بلکہ اوروں تک بھی پہونچانے کا واسطہ بنیں۔ چنانچہ جو علم عرب علماء کو حاصل ہوتا تھا۔ اُس کی بہت جلد دنیا میں عام اشاعت ہو جاتی تھی۔

دریائے فرات اور دریائے وادی الکبیر کے مابین روئے زمین کے طویل و عریض رقبے پر جتنی قومیں آباد تھیں اور جو آدمی وسطِ افریقہ کے جنوبی خطے میں بود و باش رکھتے تھے، عرب علما محققین کے دماغی جد و جہد کے ثمرات سب کو پہونچ جاتے تھے اور ان سب ممالک میں اُن کے جدید ترین علمی مسائل ہمپائے برق ہو کر شائع ہو جاتے تھے اور قابلِ تعریف امر یہ تھا کہ عربوں کے مشاغلِ کثیر اور اُن کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت بھی علم کی خدمت اور اُس کی اشاعت میں اُن کی سنگ راہ نہیں بن سکتی تھی۔

اگرچہ عرب مسلمان اس بات کے ہرگز متحمل نہیں ہوتے تھے کہ دین اسلام پر کسی اور دین کو ترجیح دیں یا اُس کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کریں، تاہم وہ بنی اسرائیل کے طرزِ تمدن سے اس بارہ میں ضرور خلاف تھے کہ مغلوب و مفتوح اقوام کی عورتوں سے تناسلی اختلاط نہ قائم کیا جائے، مگر اس تناسلی اختلاط کے باوجود اُنھوں نے اپنی عربی طبیعت اور سرشت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آنے دیا۔ وہ اُن روایات کے بہت سختی سے پابند رہے، جن سے وطنِ اصلی کی یاد تازہ ہوتی رہتی تھی، عربوں کی بود و باش کا یہ حال تھا کہ وہ تقریباً خانہ بدوش رہے۔ ہمیشہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نقلِ مقام کر کے وہاں سکونت اختیار کی اور پھر اس سے منتقل ہو کر تیسرے ملک میں چلے گئے، لیکن یہ دیکھ کر کمال حیرت ہے کہ اُن کی عادتوں اور طبیعتوں پر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہو سکا، حالانکہ اور قوموں میں نقلِ سکونت کی وجہ سے بہت کچھ تغیر طبائع اور عادات میں نمایاں ہو جاتا ہے۔

قدیم جرمن اقوام اپنے ملکوں سے نکل کر دنیا میں پھیل گئیں اور فتوحات کے ذریعے نو آبادیاں قائم کر کے وہاں سکونت اختیار کر لی، مگر انھوں نے ترکِ وطن اور حصولِ سلطنت کے بعد بہت دیر میں اپنے تمدن کا آغاز کیا۔ لیکن عربوں کا معجزہ دیکھیے کہ وہ اپنے مفتوحہ ممالک میں دین اسلام کا نور، اپنی کامل زبان اور اپنے اشعار کے لطائف۔ ایک ساتھ پھیلاتے چلے گئے، گویا دنیا کی قومیں اسی انتظار میں بیٹھی تھیں کہ عرب فاتحین کی ہر ادا کو دلی رغبت سے

اختیار کرلیں۔ چنانچہ فرانس کے صوبہ پروانسہ کے وہ شاعر جو فرنگستان کی خاک سے اُٹھے یا دیگر فرنگی مغنی و مطرب جب عشق و مستی کا دلولہ انگیز کلام کہتے یا گاتے تھے تو انہیں کے طرزِ سخن اور اندازِ طرب و غنا کی پیروی کرتے تھے، اور یہ صرف چند روزہ عربی حکومت میں رہنے کا اثر تھا۔

محلاتِ نظریہ

اس مبحث میں مندرجہ ذیل باتیں مزید توضیح و اصلاح چاہتی ہیں:

۱۔ مسلمانوں میں علم و حکمت کا آغاز

۲۔ عربوں کا علم الانوار

۳۔ سن ہجری کا آغاز

۴۔ اسلامی ثقافت کے ارتقاء میں عربوں اور غیر عربوں کا حصہ۔

تبصرہ

(۱) مسلمانوں میں علم و حکمت کا آغاز موسیو سدیو نے اس مبحث کا افتتاح بدیں طور کیا ہے:-

"یہ فخر عرب خلفاء کے زمرہ میں ابوجعفر المنصور عباسی کو حاصل ہے کہ اُس نے سب سے پہلے عربوں کو دماغی اور ذہنی مشاغل میں مشغول کیا"

علم و حکمت کی تشویق و تشجیع اسلام کی بنیادی تعلیم میں مضمر ہے اور جس تیزی سے اس کا تحقق ہوا اُس کا ایک مختصر خاکہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ مگر امویوں کے "ملک عضوض" کے زمانہ میں یہ ترقی کی رفتار بالکل رک گئی، اُن کے زمانہ میں تنہا شخصیت خالد کی ہے، جس نے ذاتی مصالح کی بناء پر کیمیا اور طب و نجوم کی کتابیں یونانی و قبطی سے عربی میں ترجمہ کرائیں۔ مگر خالد کی اس علم دوستی کے پیچھے زر طلبی کا جذبہ کارفرما تھا[۱] لہٰذا جو مثال اُس نے قائم کی اُس سے عام معاشرہ متاثر نہ ہوسکا۔

---

[۱] چنانچہ ابن ندیم لکھتا ہے کہ کسی نے اسے مہوسی کے چکر میں پڑنے پر ملامت کی تھی تو اُس نے کہا میرا مقصد محض اس سے حصولِ زر ہے۔ وہ لکھتا ہے: (الفہرست صفحہ ۴۹) "یقال انہ قیل لہ: لقد فعلت اکثر شغلک فی طلب الصنعة - فقال خالد: ما طلب بذاک الا ان اغنی اصحابی واخوانی - انی طمعت فی الخلافہ فاختزلت دونی - فلم اجد منها عوضاً الا ان ابلغ آخر هذه الصناعة، فلا احوج احد اعرفنی یوماً او عرفته الی ان یقف بباب سلطان رغبة او رهبة"

بہرحال عربوں کے تحصیلِ علم کی تین منزلیں ہیں :-

(ا) قبل بعثتِ اسلام (ب) صدر اسلام اور (ج) عباسی خلافت کا زمانہ -

ا- اسلام سے قبل جو خالص عربوں کا عہد ہے، اُن کا علم اُن کی زبان اور شعر و شاعری پر مشتمل تھا۔ چنانچہ قاضی صاعد عرب جاہلیۃ کی مذہبی حالت بتانے کے بعد اُن کی علمی حالت کے بارے میں لکھتا ہے :

"واما علمها الذی کانت تتفاخر به وتباری به فعلم لسانها واحکام لغتها ونظم الاشعار وتالیف الخطب" (طبقات الامم صفحہ ۶۸)

بہرحال عربوں کے وہ علوم جن پر وہ فخر و مباہات کیا کرتے تھے تو وہ اُن کا اپنی زبان اور لغت کا علم ہے یا اشعار کا نظم کرنا یا خطبوں کا مرتب کرنا۔

یا کچھ دیسی نجوم کا علم تھا۔ جسے وہ "علم الانواء" کہتے تھے۔ چنانچہ قاضی صاعد آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"وکان للعرب مع هذا معرفة باوقات مطالع النجوم ومغاربها وعلم بانواء الکواکب وامطارها" (ایضاً صفحہ ۷۰)

اس کے ساتھ عربوں کو ستاروں کے جائے طلوع و جائے غروب اور اوقاتِ طلوع و غروب کی کچھ واقفیت تھی، نیز نچھتروں اور بارش کا کچھ علم تھا۔

لیکن اس تجرباتی نجوم (علم الانواء) کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

ب- صدر اسلام میں خالص نسلی عربوں کے ساتھ عجمی موالی بھی جنھوں نے اسلام اختیار کر لیا تھا، شریک ہو گئے تھے اور کچھ دن کے بعد تو شریک غالب بن گئے۔[1] مگر اس زمانہ کے علوم بھی صرف لسانیات، دینیات اور مبادی طب میں محدود تھے، چنانچہ قاضی صاعد لکھتے ہیں :-

"وکانت العرب فی صدر الاسلام لا تعنی بشیٔ من العلم الا بلغتها ومعرفة احکام شریعتها، حاشا صناعة الطب"[2]

اہلِ عرب اسلام کے ابتدائی زمانہ میں کسی علم کے ساتھ اعتنا نہیں کرتے تھے صرف اپنی لغت اور اپنی شریعت کے احکام کی معرفت رکھتے تھے یا (پھر تھوڑا سا) طب کا تجربہ رکھتے تھے۔

پچھلے دور کے علم الانواء کو چوں کہ اسلام نے ناجائز قرار دیا تھا، اس لئے اس کے ساتھ اعتنا بالکل متروک ہو گیا۔ اور اموی عہد کے دورِ زوال میں تو اس ممانعت کے بہانے سائنٹفک علم الہیئت سے بھی پہلو تہی کی جانے لگی : چنانچہ

---

[1] صحابہ میں تو تفسیر، حدیث، فقہ اور نحو کے جاننے والے عرب تھے مگر تابعین کے زمانہ سے تو ان علوم کے فضلاء کی اکثریت عجمی مسلمانوں (موالی) ہی میں ہونے لگی۔ [2] طبقات الامم صفحہ ۷۴۔

جب ہشام اموی (۱۰۵-۱۲۵ھ) سے کہا گیا کہ خراج کی وصولی کا وقت جو فصل کے اعتبار سے ہونا چاہئے، اُس سے بہت پہلے ہوجاتا ہے، اس سے رعایا کو بہت تکلیف ہے لہٰذا اس دن کا تعین از سرِ نو کیا جانا چاہئے تو ہشام نے یہ کہہ کر اس مطالبہ کو ٹال دیا کہ ایسا کرنا قرآنی ممانعت سے سرتابی کرنا ہوگا، چنانچہ البیرونی لکھتا ہے:-

"ان الفرس کانوا یکبسونها - فلما جاء الاسلام عطل واضر ذلک بالناس واجتمع الدهاقنة زمن هشام بن عبد الملک الی خالد القسری فشرحوا له هذا وسألوه ان یوخر النوروز شهرا - فابی وکتب الی هشام بذلک - فقال انی اخاف ان لایکون هذا من قول الله تعالی: انما النسئ زیادة فی الکفر" (الآثار الباقیہ ص ۳۲ -)

اہلِ ایران میں لوند کا مہینہ مقرر کرنے کا رواج تھا، مگر جب اسلام مبعوث ہوگیا تو یہ نظام معطل ہوگیا، لیکن اس سے لوگوں کو بڑا ضرر پہونچا۔ اس لئے زمین دار لوگ بزمانہ ہشام بن عبد الملک خالد بن عبد اللہ القسری کے پاس پہونچے اور صورتِ حال اُس کے گوش گزار کرنے کے بعد نوروز کے (جس دن خراج واجب ہوتا تھا) ایک مہینہ موخر کرنے کی درخواست کی، اس نے انکار کر دیا اور معاملہ کو ہشام کے پاس بھیجا۔ تو ہشام نے کہا مجھے خوف ہے کہ کہیں ایسا کرنا "نسئ" کے مترادف نہ ہو جسے قرآن میں ازدیادِ کفر کا موجب کہا گیا ہے۔

جب ان معمولی علوم کے ساتھ ان عربوں کی بے اعتنائی کا یہ عالم تھا تو فلسفہ وحکمت کا تو کہنا ہی کیا، چنانچہ وہ خالص عربوں کی کل علمی کائنات گنانے کے بعد خصوصیت سے فلسفہ وحکمت سے اُن کی طبعی محرومی کی تصریح کرتا ہے اور لکھتا ہے:-

"فهذا ما کان عند العرب من المعرفة - واما علم الفلسفة فلم یمنحهم الله عزوجل شیئًا منه ولا هیأ طباعهم للعنایة به" (طبقات الامم صفحہ ۷۰)

یہ تھی صدرِ اسلام میں عربوں کی کل علم ومعرفت کی کائنات رہا فلسفہ تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے بالکل محروم رکھا ہے اور اُن کا مزاج ہی اس قابل نہیں بنایا کہ اس کے ساتھ اعتناء کرسکیں۔

یہی نہیں بلکہ بقول قاضی صاعد سوائے دو ایک فضلاء کے عربوں میں کوئی فلسفی پیدا ہی نہیں ہوا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

(ج) لیکن تیسری منزل میں، جو صرف نام ہی کے لئے عربوں کا کارنامہ کہا جاسکتا ہے (کیوں کہ درحقیقت اس دور میں تمام علوم کے فضلاء غیر عرب (موالی) یا آزاد عجمی مسلمان ہی تھے، اس منزل میں صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے اور علم وحکمت

کا چرچا عام ہو جاتا ہے، چنانچہ قاضی صاعد نے اموی عہد کی علمی و ثقافتی بیمائگی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد عباسی عہد کی علمی ترقی اور ثقافتی ثروت کا تذکرہ کیا ہے:-

"فهذه كانت حالة العرب في الدولة الاموية فلما اوال الله تعالى تلك الدولة للهاشمية وصرف الملك اليهم ثابت الهمم عن غلتها وهبت الفطن من سنتها" (طبقات الامم صفحہ ۷۵)	یہ تھی عربوں کی حالت اموی عہدِ خلافت میں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حکومت کو لوٹا کر ہاشمی خاندان کی طرف پھیر دیا اور ملک و دولت بھی اس خاندان میں آگئے تو اللہ تعالیٰ نے ہمتوں کو استواری بخشی اور فطانتیں اپنے جمود و غفلت سے بیدار ہو گئیں۔

غرض عباسیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد صورتِ حال بالکل بدل گئی کیوں کہ یہ محض حکمراں خاندانوں کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا۔ "زاب" کی لڑائی صرف امویوں اور عباسیوں کے اقتدار کی لڑائی نہ تھی، "یہ عرب کے سوزِ دروں" اور "عجم کے حسنِ طبیعت" کا مقابلہ تھا، جس میں موخر الذکر کو کامیابی ہوئی، چوں کہ عباسی ایرانیوں کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے تھے، لہٰذا انھوں نے قدیم ایرانی بادشاہوں کی طرح علم و حکمت کی سرپرستی پر توجہ دی،

پہلا عباسی خلیفہ ابو العباس سفاح تھا جس کا وقت "بازانقلابات" کے سدباب اور استحکام مملکت کی کوششوں میں گزرا۔ اُس نے چار سال کی خلافت کے بعد ۱۳۶ھ میں وفات پائی، اس کے بعد ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا جس نے باقاعدہ اس علمی تحریک کا آغاز کیا۔ چنانچہ قاضی صاعد کہتے ہیں:

"فكان اول من عني منهم بالعلوم الخليفة الثاني ابوجعفر المنصور" [۱]	اس خاندان میں پہلا شخص جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی خلیفہ ثانی ابو جعفر منصور تھا۔

منصور خود صاحبِ علم و فضل تھا چنانچہ قاضی صاعد آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"فكان رحمه الله مع براعته في الفقه وتقدمه في علم الفلسفة وخاصة في علم صناعة النجوم كلفاً بها وباهلها" [۲]	پس وہ فقہ میں دستگاہِ عالی اور علمِ فلسفہ میں بالخصوص فنِ نجوم میں درجۂ کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کا شوقین اور اس کے ماہرین کا قدردان بھی تھا۔

[۱] طبقات الامم ص ۷۵۔ [۲] ایضاً۔ ص ۷۵۔

منصور کا ابتدائی زمانہ علوی دعویدارانِ خلافت کی شورشوں کے دبانے میں گزرا۔ جب اس سے فراغت ملی تو اس نے علم وحکمت کی سرپرستی پر توجہ دی، چنانچہ سیوطی نے ذہبی سے نقل کیا ہے کہ ۱۴۳ھ سے علوم وفنون کی باقاعدہ تدوین شروع ہوئی:-

"قال الذهبی فی سنة ثلث واربعین و مائة شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث والفقه والتفسیر..... وکثر تدوین العلم وتبویبه ودونت کتب العربیة واللغة والتاریخ وایام الناس وقبل هذا العصر کان الائمة یتکلمون من حفظهم او یردون العلم من صحف صحیحة غیر مرتبة" (تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۷۷-۱۷۸)

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ۱۴۳ھ سے اس عہد میں علماء نے حدیث، فقہ اور تفسیر کے مدون کرنے کی شروعات کی...... علوم کی تدوین بڑھ گئی اور وہ ابواب وفصول میں مرتب ہونے لگا۔ عربیت، لغت، تاریخ اور ایام الناس کے موضوعوں پر کتابیں مرتب ہونے لگیں۔ اس سے پہلے ائمہ فن یا تو اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے تقریر کیا کرتے تھے یا ایسی یادداشتوں سے علم کی روایت کرتے تھے جو غیر مرتب ہوتی تھیں۔

خود امام ذہبیؒ نے "تذکرۃ الحفاظ" میں لکھا ہے:-

"وفی عصر هذه الطبقة تحولت دولة الاسلام من بنی اُمیة الی بنی العباس..... وشرع الکبار فی تدوین السنن وتالیف الفروع وتصنیف العربیة......... وانما کان قبل ذلك علم الصحابة والتابعین فی الصدور" (تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ)

اس طبقہ کے زمانہ میں حکومت بنی اُمیہ سے بنی عباس میں منتقل ہوگئی........ اور بڑے بڑے علماء نے سنن کی تدوین، فروع کی تالیف اور عربیت کی کتابوں کی تصنیف کی ابتدار کی........ ورنہ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کا علم صرف اُن کے سینہ میں محفوظ رہا کرتا تھا۔

اسی طرح مسعودی نے محمد بن علی الخراسانی سے نقل کیا ہے:-

"المنصور اول الخلیفة قرب المنجمین وعمل باحکام النجوم...... واول خلیفة ترجمت

منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب بخشا اور ان کے مشوروں پر عمل کیا۔ وہ پہلا خلیفہ ہے جس کے لئے

له الکتب السریانیة والاعجمیة بالعربیة ککتاب کلیلة ودمنة واقلیدس "[1] سریانی اور عجمی (پہلوی) زبانوں سے عربی میں کتابیں ترجمہ کی گئیں جیسے کہ کتاب کلیلہ ودمنہ اور اُقلیدس کی اصول الہندسہ

منصور کا منجم خصوصی نوبخت تھا۔ جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اُس کا بیٹا ابو سہل بن نوبخت منجم باشی ہوا۔ نوبخت ہی نے ابراہیم بن عبداللہ کے مقابلے میں منصور کی فتح کی پیشین گوئی کی تھی[2] اور جب وہ فتح کی خوش خبری سنانے آیا تو اُس نے اُسے ایک بڑی جاگیر انعام میں دی۔[3]

منصور کے عہد کا دوسرا مشہور منجم ماشاء اللہ تھا، جس نے نوبخت کے ساتھ مل کر بغداد کی بنیاد ڈالنے کی مہورت نکالی تھی۔[4] نوبخت، ابراہیم بن محمد الفزاری اور طبری کی نگرانی میں مہندسین (انجنیروں) نے بغداد کو تعمیر کیا تھا۔[5] شہر کے چار ربع چار مشہور مہندسوں نے تعمیر کئے تھے:-

باب کوفہ سے باب بصرہ تک عمران بن وضاح نے، باب کوفہ سے باب شام تک عبداللہ بن محرز نے، باب شام سے دجلہ کے پُل تک حجاج بن یوسف بن مطر نے اور بابِ خراسان سے دجلہ کے پُل تک شہاب بن کثیر مہندس نے۔[6]

اس عہد کے مشہور ہیئت دانوں کے نام یہ ہیں:-

ابراہیم بن حبیب الفزاری: نجوم وہیئت میں دستگاہِ عالی رکھتا تھا اور اس فن کی کئی کتابوں کا مصنّف ہے۔[7] وہ عہدِ اسلام میں پہلا فاضل ہے جس نے اصطرلاب بنایا۔ اس کی کتاب "تسطیح الکرہ" اصطرلاب سازی کے باب میں بعد کے مسلمان ہیئت دانوں کا ماخذ تھی۔[8]

محمد بن ابراہیم الفزاری: غالباً موخر الذکر کا بیٹا تھا۔ وہ علمِ ہیئت اور حرکاتِ کواکب کا فاضل، نجومی اور پیشین گوئی کا ماہر تھا۔[9] حسب تصریح ابن القفطی وہ پہلا شخص ہے، جس نے تاریخِ اسلام میں عموماً اور عباسی دَور میں خصوصاً اس علم میں تبحر حاصل کیا۔[10]

---

[1] مروج الذہب ومعدن الجواہر برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد عاشر ص ۱۴۰۔ [2] کامل لابن الاثیر جلد خامس ص ۲۱۰۔ [3] ایضاً ص ۲۱۲۔
[4] "وضع اساس المدینة فی وقت اختاره نوبخت المنجم وماشاء اللہ بن ساريد" (کتاب البلدان لابن واضح الیعقوبی ص ۲۳۸)
[5و6] کان الذین ہندسوہا عبداللہ بن محرز والحجاج بن یوسف وعمران بن الوضاح وشہاب بن کثیر بحضرة نوبخت وابراہیم بن محمد الفزاری والطبری" (ایضاً ص ۲۴۱)
[7و8] ابراہیم بن حبیب الفزاری: الامام العالم المشہور المذکور فی حکماء الاسلام وہو اول من عمل فی الاسلام اصطرلابا وله کتاب فی تسطیح الکرة منه اخذ کل الاسلامیین ..... وله تصانیف مذکورة منہا کتاب القصیدہ فی علم النجوم وکتاب المقیاس للزوال وکتاب الزیج علی سنی العرب وکتاب العمل بالاصطرلابات ذوات الحلق وکتاب العمل بالاصطرلابات المسطح" (اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۴۳)
[9و10] محمد بن ابراہیم الفزاری: فاضل فی علم النجوم متکلم فی حوادث الحدثان خبیر بتیسیر الکواکب، وہو اول من عنی فی الملة الاسلامیة وفی ادائل دولة العباسیة بہذا النوع" (ایضاً صفحہ ۱۲۷)

محمد بن ابراہیم الفزاری ہی نے منصور کے ایماء سے سدھانت کا ترجمہ کیا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

یعقوب بن طارق: سدھانت کو عربی میں منتقل کرنے میں محمد بن ابراہیم الفزاری کا شریک تھا۔ ہندی عالم سدھانت کی مدد سے اُس نے ہندوستانی ہیئت کے "ادوار اربعہ" (چترگیہ) کو عربی میں منتقل کیا تھا۔[1] علم ہیئت میں اس کی خاص کتاب "ترکیب الافلاک" ہے۔

البطری (غالباً پورا نام عمر بن فرخان البطری): تاریخ اسلام کے چار حذاق مترجمین میں محسوب ہوتا ہے۔[2] اُس نے بطلیموس کی "کتاب الاربعہ" کی جسے ابو یحییٰ البطریق نے ترجمہ کیا تھا، شرح لکھی تھی۔[3]

نوبخت: منصور کا منجم خصوصی تھا۔[3] اسی نے ماشاء اللہ کے ساتھ مل کر بغداد کا سنگِ بنیاد رکھنے کی مہورت نکالی تھی۔

ماشاء اللہ: منصور کے زمانہ کا بہت بڑا جیوتشی تھا۔ نجوم اور جیوتش کی متعدد کتابوں کے علاوہ ابن الندیم نے اصطرلاب پر اس کی کئی کتابیں بتائی ہیں جیسے "کتاب صنعۃ الاصطرلابات والعمل بہا" "کتاب ذات الحلق" وغیرہ۔[4]

غالباً اس وقت بغداد میں عرب نظامِ فلکیات (علم الانواء) متداول تھا۔ اسی انداز پر ابراہیم بن حبیب الفزاری نے اپنی زیج "کتاب الزیج علی سنی العرب" مرتب کی تھی۔ اور اسی انداز پر اُس کے بیٹے محمد بن ابراہیم الفزاری سے منصور نے برہم سدھانت کا ترجمہ کرایا تھا۔ (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

دوسرا ہیئتی نظام ایرانیوں کا تھا جس کی بنیاد "زیج شہریار" (یا "زیک شتریار") پر تھی۔

اسی زمانہ میں ایک تیسرا نظامِ ہیئت بغداد کے علمی حلقوں میں داخل ہوا، یہ ہندوستان کا ہیئتی نظام (سدھانت) تھا۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:-

"ان الحسین بن محمد بن حمید المعروف بابن الادمی ذکر فی زیجہ الکبیر المعروف بنظم العقد انہ

اور حسین بن محمد بن حمید المعروف بابن الآدمی نے اپنی بڑی زیج معروف بہ "نظم العقد" میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۵۶ھ میں

---

[1] "قال ابو معشر فی کتاب المذاکرات لشاذان حذاق التراجمۃ فی الاسلام اربعۃ: حنین بن اسحاق ویعقوب بن اسحاق الکندی وثابت بن قرہ الحرانی وعمر بن فرخان الطبری" (طبقات الاطباء جلد اول ص۲۰۷) [2] "عمر بن الفرخان ..... احد رؤس التراجمۃ والمتحققین بعلم حرکات النجوم ..... لہ کتباً کثیرۃ فی النجوم ..... منہا کتاب تفسیر الاربع مقالات لبطلیموس من نقل ابن یحییٰ البطریق" (ابن القفطی ص۲۶۰)

[3] "کان نوبخت ابوہ (ابو ابی سہل بن نوبخت) منجماً ایضاً فاضلاً یصحب المنصور۔ فلما ضعف نوبخت عن الصحبۃ قال لہ المنصور احضر ولدک لیقوم مقامک" (ایضاً ص۲۶۶) [4] الفہرست لابن الندیم ص۳۸۲: "کان فاضلاً اوحد زمانہ فی علم الاحکام ولہ من الکتب ..... کتاب صنعۃ الاصطرلابات والعمل بہا وکتاب ذات الحلق ....." [5] کتاب ما للہند من مقولہ مقبولہ عند العقل او مرذولہ للبیرونی ص۲۰۸۔

قدم علی الخلیفة المنصور فی سنه ست و خمسین ومائة رجل من الهند عالم بالحساب المعروف بالسند هند فی حرکات النجوم مع تعادیل معلومة علی کروجات محسوبة لنصف نصف درجة مع ضروب من اعمال الفلك ومع کسوفین ومطالع البروج وغیر ذلك فی کتاب یحتوی علی اثنی عشر بابا..... فامر المنصور بترجمة ذلك الکتاب الی اللغة العربیة و ان یولف منه کتاب تتخذه العرب اصلاً فی حرکات الکواکب، فتولی ذلك محمد بن ابراهیم الفزاری وعمل منه کتاباً یسمیه المنجمون بالسند هند الکبیر..... فکان اهل ذلك الزمان یعملون به الی ایام الخلیفة المامون"[1]

خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں ایک شخص ہندوستان سے پہونچا جو وہاں کے مخصوص ہیئتی حساب "سدھانت" میں ماہر تھا۔ اس کے ساتھ ایک کتاب (برہم سدھانت) بھی تھی جو حرکاتِ نجوم آدھے آدھے کروجہ کی تعدیلات، نیز دیگر اعمالِ فلکیہ اور کسوف وخسوف اور مطالع بروج وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اس میں بارہ ابواب تھے.....

پس منصور نے اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کرنے، نیز اس کے اصول پر علمِ ہیئت کی ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا، جسے عرب حرکاتِ کواکب کے حساب میں اصل ومعتمد علیہ بنائیں۔ پس محمد بن ابراہیم الفزاری نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور اس کی مدد سے ایک کتاب تیار کی جسے ماہرینِ فلکیات "السند ہند الکبیر" کہتے ہیں۔ ..... اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک اسی پر عمل کرتے تھے۔"

قاضی صاعد نے ہندوستان کے اس علمی وفد کا سال آمد ۱۵۶ھ بتایا ہے لیکن البیرونی ۱۵۴ھ کہتا ہے۔[2]

واللہ اعلم بالصواب۔

برہم سدھانت ہی کے ذریعہ مسلمان مہندسین "جیب" (SINE) کے تصور سے واقف ہوئے ورنہ یونانی اور ایرانی علم الہیئت میں "اوتار" (CHORDS) ہی کے ذریعہ "مثلثاتی حسابات" کئے جاتے تھے، اس طرح "علم المثلثات" کی ترقی میں مسلمانوں کا یہ پہلا قدم تھا۔

منصور کو علم وحکمت کی ترقی سے اس درجہ دلچسپی تھی کہ اُس نے رومی بادشاہوں سے یونانی حکمت وریاضیات وطبیعیات) کی کتابیں ترجمہ کرا کر منگائیں:-

---

[1] طبقات الامم صفحہ ۷۸ [2] کتاب الہند للبیرونی۔ ص ۲۰۸

"فبعث ابو جعفر المنصور الی ملك الروم ان یبعث الیه بکتب التعالیم مترجمة فبعث الیه بکتاب اُوقلیدس وبعض کتب الطبیعیات فقرأها المسلمون واطلعوا علی ما فیها فازدادوا حرصاً علی الظفر بما بقی منها۔" [1]

پس خلیفہ ابو جعفر نے بادشاہ روم کو ریاضیات کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے بھیجنے کے لئے لکھا، پس اُس نے اُقلیدس کی "اصول ہندسہ" اور طبعیات کی کچھ کتابیں اُس نے بھیجیں جنھیں مسلمانوں نے پڑھا اور ان کے مضامین سے واقف ہوئے، اس سے ان کتابوں کے لئے جو روم میں رہ گئی تھیں، اُن کا شوق اور بڑھ گیا۔"

منصور ہی کے زمانہ میں سب سے پہلے "اُصول اُقلیدس" کا عربی میں ترجمہ ہوا اور غالباً یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن خلدون کہتا ہے:-

"کتاب اوقلیدس ویسمّٰی کتاب الاصول ..... اول ما ترجم من کتب الیونانیین فی الملة ایام ابی جعفر المنصور" [2]

کتاب اُقلیدس، اسے "کتاب الاصول" بھی کہا جاتا ہے.... یونانی کتابوں میں سب سے پہلی کتاب ہے جو ابو جعفر المنصور کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں میں ترجمہ ہوئی۔ (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۳۲)

منصور ہی کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ارسطاطالیسی منطق کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:-

"فاما المنطق فاول من اشتهر به فی هذه الدولة عبد الله بن المقفع الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر المنصور فانه ترجم کتب ارسطاطالیس المنطقیة الثلاثة التی فی صورة المنطق وهی کتاب قاطاغوریاس وکتاب باری ارمینیاس وکتاب انولوطیقا وذکر انه لم یترجم منه الی وقته الا الکتاب الاول فقط وترجم ذلك المدخل الی کتاب المنطق المعروف بالایساغوجی لفورفوریوس الصوری" [3]

رہی منطق تو سب سے پہلے جو شخص اس حکومت میں اس میں تبحر کے لئے مشہور ہوا وہ عبد اللہ بن المقفع مشہور ایرانی خطیب اور منصور کا کاتب تھا۔ اُس نے ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں کا جو صوری منطق پر مشتمل ہیں، عربی میں ترجمہ کیا یعنی قاطیغوریاس (کتاب المقولات) باری ارمینیاس (کتاب العبارۃ) اور انالوطیقا (کتاب القیاس) کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے سوائے پہلی کتاب کے اور کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ عبد اللہ المقفع نے ان تین کتابوں کے علاوہ فرفوریوس کی ایساغوجی کا بھی ترجمہ کیا تھا۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶۔ [2] ایضاً ص ۵۳۲۔ [3] طبقات الامم ص ۷۷۔

غالباً عبداللہ بن المقفع نے یہ کتابیں پہلوی تراجم سے نقل کی تھیں۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو معارف مئی ۱۹۵۷ء)
منصور ہی کے زمانہ میں یونانی طب ۱۴۸ھ میں جندی سابور سے بغداد میں داخل ہوئی، ہوا یہ کہ اس سال منصور سخت بیمار ہوگیا اور جب اطبائے دربار کے علاج سے افاقہ نہ ہوا تو جندی سابور سے جورجیس بن جبرئیل طبیب کو بلایا گیا۔ اس کے علاج سے منصور کو صحت ہوئی۔ اس کے بعد منصور نے جورجیس کو اپنا طبیبِ خصوصی بنالیا، جورجیس نے منصور کے حکم سے بہت سی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ابن ابی اُصیبعہ نے لکھا ہے:-

جورجیس بن جبرئیل کانت له خبرة بصناعة الطب ومعرفة بالمداواة وانواع العلاج وخدم بصناعة الطب المنصور وکان خطیاً عنده رفیع المنزلة ..... وقد نقل للمنصور کتباً کثیرة عن کتب الیونانیین الی العربی۔" [1]

"جورجیس بن جبرئیل: اُسے فن طب میں بہت اچھی مہارت تھی، دواسازی اور طریقِ علاج سے واقف تھا، منصور کا معالجِ خصوصی تھا اور اُس کے صلات و جوائز سے برابر مستفید ہوتا رہتا تھا۔ ..... منصور کے ایماء سے بہت سی یونانیوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔

یہ تھی مسلمانوں میں علم وحکمت کی باضابطہ ابتداء جو حقیقتاً "شاندار ابتداء" کہلانے کی مستحق ہے۔ بعد کی تاریخ آگے آئے گی۔

(۲) عربوں کا دیسی علم نجوم (علم الانواء) | عرب کی آب وہوا اور کھلا آسمان بابل وکالدیا کی طرح فلکیاتی مشاہدات کے لئے بہت زیادہ سازگار رہیں چنانچہ انھوں نے عہدِ جاہلیہ (قبل اسلام) میں ایک مخصوص فلکیاتی نظام بھی مرتب کرلیا تھا جسے وہ علم الانواء کہتے تھے مگر اس پر ہیئت کا تو کم البتہ جیوتش کا زیادہ اطلاق ہوسکتا ہے۔ اور چوں کہ جوتش اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہے، اس لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انواء کو بھی ممنوع قرار دیا تھا۔ حدیث شریف میں ہے۔
"مناظر النجوم" میں عربوں کی ہیئت دانی کے بارے میں لکھتا ہے:-

عرب پسند حضرات کو اس قدیم دیسی نظام یا "علم الانواء" پر بڑا فخر تھا، چنانچہ ابن قتیبہ اپنی "کتاب الانواء" میں لکھتا ہے

"انی رأیت علم العرب بها هو العلم الظاهر للعیان الصادق عند الامتحان، النافع لنازل البر

میں نے دیکھا ہے کہ اس باب میں عربوں کا علم (علم الانواء) ایسا علم ہے جو ظاہر اور عیاں ہے (جو خالی آنکھوں کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے)

[1] طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ جلد اول صفحہ ۱۲۲۔

دراکب البحر وابن السبیل[1] امتحان کے وقت سچا ثابت ہوتا ہے اور سمندر اور خشکی سبھی کے مسافروں کے لئے مفید ہوتا ہے۔

چنانچہ اکثر عرب مصنفین نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں: جیسے کتاب الانواء للاصمعی، کتاب الانواع لابی محلم، کتاب الانواء لقطرب، کتاب الانواء لابن الاعرابی، کتاب الانواء للمبرد، کتاب الانواء لابن قتیبہ، کتاب الانواء لابی حنیفۃ الدینوری، کتاب الانواء للزجاج، کتاب الانواء لابن درید، کتاب الانواء للدہنی، کتاب الانواء للمزیدی، کتاب الانواء لوکیع، کتاب الانواء لابن عمار، کتاب الانواء لابی غالب احمد بن سلیم الرازی، کتاب الانواء لمحمد بن حبیب۔[2]

اور لوگوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھی تھیں، سب سے پہلا مصنف ابو فید مورج بن سدوسی (المتوفی ۱۹۵ھ) ہے۔ متاخرین میں ابن درید (المتوفی ۳۲۱ھ) اور الزجاجی (المتوفی ۳۳۷ھ) زیادہ مشہور ہیں۔

غرض یہ "عرب نظام فلکیات" چوتھی صدی ہجری کے وسط تک یونانی "علم الکواکب الثابتۃ" (URANOMETERY) کے حریف کی حیثیت سے مروج رہا، چنانچہ مشہور ہیئت داں عبد الرحمٰن الصوفی اپنی کتاب "صور الکواکب الثابتۃ" میں لکھتا ہے:-

"انی رأیت کثیراً من الناس یخوضون فی طلب معرفۃ الکواکب الثابتۃ ..... ووجدتہم علی فرقتین: احداہما تسلک طریقۃ المنجمین ..... واما الفرقۃ الاخری فانہا سلکت طریقۃ العرب فی معرفۃ الانواء ومنازل القمر - ومعولہم علی ما وجدوہ فی الکتب المؤلفۃ فی ہذا المعنی۔[3]	میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جو کواکب ثابتہ کے علم میں غور و فکر کرتے ہیں ..... اُن کی دو جماعتیں ہیں: ایک ہیئت دانوں کے طریقہ کی عامل ہے ..... اور دوسری جماعت عربوں کے طریقہ پر عمل پیرا ہے جس طرح وہ نچھتروں کی معرفت، اور چاند کی منزلوں کا علم رکھتے تھے۔ اس باب میں اُن کا اعتماد اُن کتابوں پر ہے جو اس موضوع پر تصنیف ہوئی ہیں۔

بہرحال عرب علم الانواء میں سب سے بہتر ابو حنیفہ الدینوری کی کتاب الانواء تھی۔ چنانچہ عبد الرحمٰن الصوفی آگے چل کر لکھتا ہے:-

"ووجدت فی الانواء کتباً کثیرۃ اتمہا واکملہا فی فنہ کتاب ابی حنیفۃ الدینوری فانہ	مجھے علم الانواء میں بہت سی کتابیں ملیں مگر ان میں سب سے مکمل ابو حنیفہ الدینوری کی کتاب ہے جس سے معلوم

[1] کتاب الانواء لابن قتیبہ ص ۲۔ [2] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۱۳۰۔ و نیز دیگر صفحات متفرقہ۔
[3] صور الکواکب لعبد الرحمٰن الصوفی۔ ص ۱-۷)

یدل علی معرفة تامة بالاخبار الواردة عن العرب فی ذلك واشعارها واسجاعها فوق معرفة غیرہ ممن الفوا الکتب فی ھذا الفن۔[1]

ہوتا ہے کہ اُسے اُن روایات کے اور جو اس باب میں عربوں سے مروی ہیں اور اشعار و اسجاع جو اُن سے مروی ہیں دوسرے مصنفین انواء سے زیادہ معرفت تام تھی۔

ابوحنیفہ الدینوری کی کتاب کو غالباً ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "مناظر النجوم" میں (بقول مسعودی) ہتیا لیا تھا۔ ابن قتیبہ کی کتاب دائرة المعارف حیدر آباد سے چھپ گئی ہے۔

یہ عربوں کا "علم الانوار" تھا۔ اس کے علاوہ یونانیوں کے علم الانواء (EPISYMASIA) پر بھی حکماء اسلام نے کتابیں لکھی تھیں۔ ان میں سے حسن بن سہل بن نوبخت، ابو معشر بلخی، ثابت بن قرہ، سنان بن ثابت بن قرہ کی "کتاب الانواء" زیادہ مشہور ہیں۔

لیکن عربوں کا دیسی علم الانوار ہیئت کی سائنٹفک وقت نظری سے معریٰ تھا اور اسی حد تک تھا۔ جہاں تک کہ عام کسانوں اور ملاحوں کو تجربہ ہوتا ہے۔ البیرونی عرب جاہلیہ کے اس ورثہ کا بڑا سخت نقاد ہے اور ابن قتیبہ نے جو کچھ عرب علم الانواء کی تعریف کی ہے، اُس سے زیادہ شدید الفاظ میں البیرونی نے اُس کی تنقیص کی ہے:-

"وکذلك لو تاملت اسامیھم للکواکب الثابتة لعلمت انھم کانوا من علم البروج والصور بمعزل وان کان ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ الجبلی یھول ویطول فی جمیع کتبہ وخاصتہ فی کتابہ فی تفضیل العرب علی العجم وزعم ان العرب اعلم الامم بالکواکب ومطالعھا ومساقطھا ولا ادری اجھل ام تجاھل ما علیہ الزراعون والاکرة فی کل موضع وبقعة ...... ولو تاملتھا فی کتب الانواء وخاصة کتابہ الذی وسمہ بعلم مناظر النجوم ...... لعلمت

اور اسی طرح اگر تم اُن ناموں پر غور کرو جو عربوں نے کواکب ثابتہ کے رکھے تھے تو معلوم کر لوگے کہ اُنہیں بروج اور صور (CONSTELLATION) کا کوئی علم ہی نہ تھا اگرچہ ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ الجبلی وغیرہ عربوں کے علم الانواء بڑے رعب ڈالنے والے انداز میں بڑھا چڑھا کر اپنی کتابوں میں لکھا کرتا ہے۔ بالخصوص اپنی اُس کتاب میں جس میں اُس نے غیر عربوں پر عربوں کی افضلیت ثابت کی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ عرب دنیا کی ساری قوموں میں ستاروں اور اُن کے مطالع و مساقط کے سب سے زیادہ عالم تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ ابن قتیبہ کی نادانی تھی یا تجاہلِ عارفانہ

[1] کتاب صور الکواکب لعبد الرحمٰن الصوفی ص ۷۔

انهم لم يختصوا من ذلك باكثر مما اختص به فلاح وكل بقعة۔ (الآثار الباقیہ، ص ۲۳۸-۲۳۹)

کہ وہ اُن چیزوں کو بھی نہیں جانتا جو ہر جگہ اور مقام کے کسان اور کیرے جانتے ہیں...... اور اگر تم انواء پر لکھی ہوئی کتابوں میں غور کرو خاص طور سے ابن قتیبہ کی کتاب "منازل النجوم" میں...... تو جان لوگے کہ عربوں کو فلکیات کا اس سے زیادہ علم نہیں تھا جتنا کہ ہر مقام اور جگہ کے کسانوں کو ہوتا ہے۔

اس علم الانواد کا بدترین پہلو یہ تھا کہ عرب جاہلیۃ نے اجرامِ سماوی کی پرستش شروع کر دی تھی، چنانچہ حمیر آفتاب کی، کنانہ قمر کی، تمیم دبران کی، لخم وجذام مشتری کی، طے سہیل کی، قیس شعری عبور کی اور اسد عطارد کی پرستش کرتے تھے۔

اس لئے اسلام نے جس کی بعثت کا مقصدِ اسنیٰ خدائے واحد کی عبادت کا اعلان تھا، دوسرے توہمات اور ڈھکوسلوں کے ساتھ نجوم اور جوتش کی بھی ممانعت کر دی۔

(۳) سن ہجری کا افتتاح و آغاز | موسیو موصوف نے لکھا ہے کہ :-

"جب تک اُن کی مختلف طریقے کی عبادتیں منسوخ ہو کر اُنھیں بالکلیہ اسلام کی تبعیت نصیب نہیں ہوئی، اُس وقت تک اُن کا کوئی مسلسل سن قائم نہ ہو سکا"

مگر یہ بالکل بے بنیاد بلکہ مضحکہ خیز اندازِ استدلال ہے جس کا تاریخی حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ سن ہجری کا افتتاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ یا حسبِ تصریح ابن الاثیر ۱۶ھ میں کیا۔ چنانچہ ابن الاثیر ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے :-

"وفيها كتب عمر التاريخ بمشورة علي بن ابي طالب" (کامل لابن الاثیر جلد ثانی ص ۲۰۳)

اور اسی سال حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے مشورہ سے خطوط میں تاریخ لکھنا شروع کیا۔

حالانکہ عربوں کی مختلف طریقے کی عبادتیں ۸ھ میں ہی منسوخ اور کالعدم ہو چکی تھیں جبکہ سوائے یہود و نصاریٰ کے پورا جزیرہ نمائے عرب مسلمان ہو چکا تھا اور ہرچند کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۱ھ) کے بعد بعض قبائلِ عرب مرتد ہو گئے تھے مگر جلد ہی فتنۂ ارتداد کی قرار واقعی سرکوبی ہو گئی اور صدیق اکبرؓ کی وفات ۱۳ھ سے پیشتر پھر مرتدین سب مسلمان ہو گئے۔

غرض سن ہجری کے آغاز اور عربوں کے طریقہ ہائے عبادت کی منسوخی میں کوئی تعلق نہیں ہے اور موسیو موصوف کا

یہ استدلال "مارا گھٹنا پھوٹی آنکھ" کی بدترین مثال ہے، سن ہجری کے آغازِ کار کی تفصیل تواریخ میں من و عن مذکور ہے۔ اور اُن میں اس قیاس آرائی کا ادنیٰ امام بھی نہیں ملتا۔ ہوا یہ تھا کہ کسی عامل کا خط حضرت عمرؓ کے پاس آیا جس میں شعبان کے کسی واقعہ کا حوالہ تھا، آپؓ نے فرمایا: کون سا شعبان، سالِ رواں کا شعبان یا سالِ گزشتہ کا شعبان یا سالِ آئندہ کا شعبان، اس کے بعد آپؓ کو کسی سن کی تعیین کی ضرورت کا احساس ہوا اور آپ نے صحابۂ کرام سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا ولادتِ نبوی سے سن کا آغاز کیا جائے کسی نے کہا بعثت سے، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہٗ نے فرمایا کہ ہجرت ہماری تاریخ میں سب سے اہم واقعہ ہے اور اس لئے اسلامی تقویم (سن) کا آغاز ہجری ہی سے کیا جائے، حضرت عمرؓ نے بھی اس رائے کو پسند کیا اور سن ہجری کا آغاز فرمایا چنانچہ امام بخاریؒ نے "التاریخ الصغیر" میں لکھا ہے:-

"حدثنا عبد اللہ بن مسلم حدثنا عبد العزیز بن ابی حازم عن ابیہ عن سھل بن سعد قال ما عدوا من مبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا من وفاتہ ولا عدوا الا من مقدمہ المدینۃ

(التاریخ الصغیر ص ۹)

عبداللہ بن مسلم نے ہم سے حدیث بیان کی کہ عبدالعزیز بن ابی حازم نے اُن سے حدیث بیان کی، انھوں نے اپنے باپ سے اور انھوں نے سہل بن سعد سے کہ مسلمانوں نے نہ تو سن کا شمار بعثتِ نبوی سے کیا نہ آپ کی وفات اور نہ کسی اور واقعے سے۔ صرف آپؐ کی آمدِ مدینہ (ہجرت) سے سن کا شمار کیا۔

اسی طرح دوسری روایت نقل کی ہے:

"حدثنا عبد اللہ بن عبد الوھاب الحجبی حدثنا عبد العزیز بن محمد بن عثمان بن رافع قال سمعت سعید بن المسیب قال عمر متی نکتب التاریخ۔ فجمع المھاجرین فقال لہ علی من یوم ھاجر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی المدینۃ فکتب التاریخ

(ایضاً ص ۹)

ہم سے عبداللہ بن عبدالوہاب الحجبی نے حدیث بیان کی، اُن سے عبدالعزیز بن محمد بن عثمان بن رافع نے اُنھوں نے کہا میں نے سعید بن المسیب کو کہتے سنا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم کب سے تاریخ لکھیں، پس آپ نے مہاجرین کو جمع کیا۔ تب حضرت علیؓ نے فرمایا اُس دن سے جبکہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے، پس اُسی دن سے تاریخ لکھی گئی۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر سن ہجری کے آغاز اور عربوں کے طریقہ ہائے عبادت کی منسوخی میں کوئی تعلق ہوتا تو پھر "بعثتِ نبوی" سے اسلامی سن کا آغاز کیا جاتا کیونکہ بعثت ہی نے معبودانِ باطل کے بجائے خدائے واحد کی پرستش کا آغاز کیا تھا حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔

اس لئے یہ موسیو موصوف کی محض اختراعِ ذہنی ہے۔

(۴) اسلامی ثقافت کی نسلی عبقریت سے بے نیازی | موسیو سدیو نے اسلامی ثقافت کو عربوں کا کارنامہ بتایا ہے اور اس پر بڑی شدت سے اصرار کیا ہے، ہر جگہ وہ عربوں ہی کو اس کا بانی اور علمبردار قرار دیتے ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں :-

"عربوں کی طبیعت میں فطری جودت تھی..... جو علم عرب علماء کو حاصل ہوتا تھا، اُس کی بہت جلد دنیا میں عام اشاعت ہو جاتی تھی..... عرب علماء محققین کے دماغی جد و جہد کے ثمرات سب کو پہونچ جاتے تھے..... عربوں کے مشاغلِ کثیر بھی علم کی خدمت اور اُس کی اشاعت میں اُن کے سنگِ راہ نہ بن سکے۔"

حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی علمی و ثقافتی ترقی اُن کی گوناگوں نسلی و خاندانی خصوصیتوں کا نتیجہ نہ تھی، جن فضلائے باکمال نے علومِ اسلامیہ کی ثروت میں حصہ لیا ہے، اُن میں عرب بھی تھے اور عجم بھی، رومی بھی تھے اور یونانی بھی، ترک بھی تھے اور ایرانی بھی، سندھی بھی تھے اور ہندی بھی، آج ان میں سے ہر قوم اپنی گزشتہ ثقافتی عظمت کی تعریف میں رطب اللسان ہے، یہاں ان دعووں کی تائید و تردید کا کوئی محل نہیں ہے۔ لیکن ایک امرِ یقینی ہے: بعثتِ اسلام سے بہت پہلے اُن میں سے ہر قوم کی علمی و ثقافتی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں اور وہ جمود و اضمحلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں، اس صورت میں کسی مسلمان فاضل کی عبقریت اور اُس کے فضل و کمال کو اُس کی نسلی یا وطنی خصوصیات کا نتیجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عربوں کا قبلِ اسلامی دور تو ہمیشہ سے "عہدِ جاہلیہ" کا مصداق رہا ہے اور بجا طور پر رہا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔ عجمی اقوام کی حالت بھی اس سے کچھ بہتر نہ تھی :-

رومیوں نے بیشک ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، مگر علم و حکمت کی ترقی میں اُن کا کبھی کوئی حصہ نہیں رہا۔

ابنِ خلدون لکھتا ہے :-

"ولما انقرض امر اليونان وصار الامر للقياصرة واخذوا بدين النصرانية هجروا تلك العلوم..... وبقيت في صحفها ودواوينها مخلدة باقية في خزائنهم"

اور جب یونانیوں کا دور ختم ہو گیا اور روم کے قیاصرہ کے عالمی اقتدار کا آغاز ہوا اور انھوں نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا تو پھر ان علوم کو بالکل ہی چھوڑ دیا..... اور یہ علوم کتابوں اور رسالوں میں کتب خانوں کے اندر بند پڑے رہے۔ (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۲۶)

مثال کے طور پر "علم الہندسہ" کو لیجئے۔ رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں یونان کو فتح کیا اور اُس کی سیاسی عظمت کے ساتھ ۱۰۰

اُس کے "ثقافتی کمال" کے بھی وارث بنے۔ اُس کے بعد ۱۴۸۴ء تک مشرقی یورپ اور مغربی یورپ کے اور اُس کے بعد سے سقوط قسطنطنیہ تک مشرقی رومن امپائر کے حکمراں بنے رہے۔ مگر اس طویل عرصہ میں "اصول اُقلیدس" کے ساتھ اُن کے اعتناء کا یہ عالم تھا کہ اُن کی ملکی و قومی زبان لاطینی میں صرف بوئیتھیوس نے چوتھی صدی مسیحی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ بھی کیا کیا۔ صرف پہلے تین چار مقالوں کی تلخیص ہے اور بس۔ کامل اصول اُقلیدس کا لاطینی ترجمہ ۱۱۲۰ء میں ایتھیلارڈ نے عربی سے کیا۔ مگر اس کا تعلق رومن سرپرستی سے نہیں ہے بلکہ قرونِ وسطیٰ سے ہے۔ حالانکہ آٹھویں صدی کے وسط سے مسلمانوں نے اقلیدس کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور قلیل عرصہ میں متعدد ترجمے کر ڈالے، بیشمار شرحیں لکھیں اور یہی نہیں بلکہ جابجا اُقلیدس اور دوسرے قدیم ہندسہ دانوں کے اغلاط کی تصحیح و اصلاح کی۔

یونانیوں کا عالم یہ تھا کہ مشرقی رومن امپائر (بازنطینیہ) میں ثامسطیوس اور برقلس کے بعد کوئی نام کا عالم بھی نہیں ہوا۔ چنانچہ ایم، ڈی، ولف لکھتا ہے:۔

"نو فلاطونیت کے آخری علمبردار ثامسطیوس اور برقلس وغیرہ کے بازنطینیہ (مشرقی رومن امپائر) کے ساتھ تعلقاتِ آمد و رفت تھے، لیکن اُن کے بعد آٹھویں صدی مسیحی سے پہلے ہمیں وہاں کوئی قابلِ ذکر نام نہیں ملتا" (قرونِ وسطیٰ کے فلسفہ کی تاریخ صفحہ ۸۱)

ساتویں صدی مسیحی میں ہرقل نے قدیم علمی عظمت کو زندہ کرنے کی کوشش کی، مگر یہ سب بیکار ثابت ہوئی، مشہور مؤرخ فلسفہ ایم، ڈی ولف لکھتا ہے:۔

"مشرق کے مسیحی شاہنشاہوں نے فلسفہ کا مدرسہ جاری کرنے کی متعدد بار کوشش کی تاکہ نیا دارالسلطنت ایتھنز اور اسکندریہ کا حریف بن جائے ..... ۶۱۸ء میں شاہنشاہ ہرقل نے اسکندریہ کے ایک استاد کو قسطنطنیہ بلایا تاکہ اُس کی تعلیم سے بازنطینی ذہانت و فطانت اپنے جمود سے بیدار ہو جائے۔ مگر یہ سعی سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ متوقعہ بیداری کو ابھی ظہور میں آنے کے لئے نسلہا نسل درکار تھیں"

(قرونِ وسطیٰ کے فلسفہ کی تاریخ ص ۸۱)

اس سے بدتر حال مغربی یورپ کا تھا۔ جس کے بارے میں ایک دوسرا مؤرخ فلسفہ پروفیسر تھلی لکھتا ہے:۔

"ساتویں اور آٹھویں صدیاں غالباً ہماری مغربی یورپ کی تہذیبی تاریخ کا تاریک ترین زمانہ ہیں۔ یہ لاانتہا

جہالت اور بربریت و بہیمیت کا زمانہ تھا' جس کی تباہ کاریوں اور غارت گریوں کے اندر کلاسیکی عہدِ ماضی کے ادبی اور جمالیاتی کارنامے گم ہو کر رہ گئے تھے۔" (تاریخ فلسفہ صفحہ ۱۴۲)

ڈاکٹر ایم، ڈی، ولف اپنی دوسری کتاب "قدیم و جدید مسیحی علم الکلام" میں یورپ (یونان و روم) کی ثقافتی حالت کے بارے میں خود یورپی مؤرخین کا قول نقل کرتا ہے:-

"۵۲۹ء سے لیکر جبکہ قیصر جسٹینیان نے یونانی مدارس کو بند کر دیا تھا، ۱۶۳۷ء تک جبکہ ڈیکارٹ کی مقالات برمناہج شائع ہوئی، نیند کی ماتی انسانیت نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یا یوں کہئے کہ علم و حکمت کے اہم مسائل کو تفکر و رویت کے حضور میں لانا چھوڑ دیا تھا" (قدیم و جدید مسیحی علم الکلام ص ۶)

ترکوں کی تاریخِ قدیم کا تو ذکر ہی کیا جو جہالت و بربریت کی تاریکی میں مشہور ہے' چنانچہ قاضی صاعد نے اُن کا شمار اُن اقوام میں کیا ہے جن کا علم و حکمت سے کوئی تعلق نہ تھا:-

"واما الطبقة التی لم تعن بالعلوم فبقیة الامم ممن ذکرنا من ..... ترك ..... واصناف السودان من الحبشة والزنج وغانه وغیرهم" رہا وہ طبقہ جس نے علوم کے ساتھ اعتنا ہی نہیں کیا تو اُس میں باقی اقوام داخل ہیں جیسے ..... ترک یا حبش زنج، غانہ وغیرہ کے باشندے۔ (طبقات الامم ص ۹)

ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ اُن کا ملک ہمیشہ سے علم و حکمت کا گہوارہ رہا ہے بلکہ یہیں سے فلسفہ و نجوم کا آغاز ہوا اور یہیں سے یہ گوہرِ گراں مایہ یونان پہونچا۔ تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ازمنہ قدیمہ میں حکمائے یونان "مغان فارس" سے آداب ریاضت و مجاہدہ سیکھنے جاتے تھے۔ مگر بعثتِ اسلام کے قبیل جہالت کی جو عام صرصر تند باد دنیا میں چل رہی تھی، ایران بھی اُس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ فارس کا قدیم علمی و حکمی سرمایہ تو سکندر ہی لوٹ کر لے گیا تھا۔ ساسانی عہد میں اس کی تجدید کی کوشش کی گئی، مگر وہ اتنی غیر اہم تھی کہ تاریخ نے اُس کی تفصیل یاد رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی، حالانکہ اُن کی سیاسی فتوحات کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔

اسلام سے پہلے ایرانی ثقافت کا سب سے روشن دور نوشیرواں کا عہد ہے۔ اُس نے علم و حکمت کے احیاء پر خصوصی توجہ کی، مگر اُس کی علمی مساعی پر ایک ہم عصر مؤرخ اگاتھیاس نے بڑا مایوس کن تبصرہ پیش کیا ہے چنانچہ مشہور مؤرخ کرسٹن سین لکھتا ہے:-

"اگاتھیاس..... کے نزدیک یہ بات کیسے ممکن ہے کہ ایک بادشاہ جو سیاسی اور جنگی معاملات میں اس طرح معروف ہو، یونانی اور رومی ادبیات کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو بنظرِ غائر دیکھ سکے بالخصوص جبکہ اُس کے پیشِ نظر یونانی کتابوں کے صرف وہ ترجمے ہوں جو بقول اُس کے ایک اکھڑ اور بدرجہ غایت ناشائستہ زبان میں کیے گئے ہوں، یورنیوس جو..... خسرو کو فلسفہ پڑھاتا تھا، اگاتھیاس کے نزدیک وہ ایک جاہل اور فریبی شخص تھا۔"[1]

یہی نہیں بلکہ ساسانی عہد کے آخری دور کی علمی وفکری سرگرمیوں کو البیرونی اُس تشکیک وارتیابیت سے تعبیر کرتا ہے جو قوموں کے اندر زوال اور فکری جمود واضمحلال کے بعد طاری ہو جایا کرتے ہیں:۔

کچھ ایسا ہی حال ہند وسند کا تھا، اُن کا علمی وثقافتی ماضی کتنا ہی تابناک کیوں نہ رہا ہو، مگر قبیل اسلام جو بودھ مت کے علی الرغم برہمنیت کا عروج ہوا تو اُن کے تعصب وتنگ نظری نے قدیم علم وحکمت کے لئے کوئی گنجائش نہ چھوڑی، آج اُن کے علمی وحکمی کارنامے اگر کچھ محفوظ ہیں تو صرف غیر ملکی مثلاً چینی اور تبتی یا عرب مصنفین کے یہاں۔ شروع میں اُن کی طب اور ہیئت سے مسلمانوں نے اعتناء کیا مگر جلد ہی اُس کی بےمایگی کا اندازہ ہوگیا، چنانچہ البیرونی نے جو ہندوؤں کے قدیم علوم کو زندہ رکھنے کے لئے مشہور ہے ایک مستقل کتاب "ان رائے العرب فی مراتب العدد اصوب من رای الہند فیہا" کے عنوان سے لکھی تھی، جس میں ثابت کیا تھا کہ علم الحساب میں بھی جو ہندوؤں کا عظیم ترین کارنامہ ہے، عرب فائق تھے۔

رہے عرب تو اُن کی طبعی ونسلی خصوصیات ہی علم وحکمت کے ساتھ اعتناء کے لئے سازگار نہیں تھیں، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:۔

"فصل فی ان العرب ابعد الناس عن الصنائع۔ فصل اس بات میں کہ عرب نوعِ انسان میں صنائع سے سب سے زیادہ
والسبب فی ذلک انہم اعراق فی البدو وابعد بے بہرہ ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ جنگلی پن میں راسخ ہیں اور شہری
عن العمران الحضری وما یدعو الیہ من الصنائع"[2] تمدن اور اُس کی ضروری صنائع سے سب سے زیادہ دور ہیں۔

اور یہ واقعہ بھی تھا، چنانچہ قاضی صاعد کا قول اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ "فلسفہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن عربوں کو بالکل ہی بے بہرہ رکھا ہے اور اُن کا مزاج ہی اس قابل نہیں بنایا کہ وہ اُن علوم کے ساتھ اعتناء کر سکیں" چنانچہ عربی النسل لوگوں نے بعثتِ اسلام کے بعد بھی ان علوم میں کوئی ترقی نہیں کی، اموی دور میں علومِ دینیہ اور لسانیات میں ضرور ترقی ہوئی، مگر اس میں زیادہ حصہ غیر عرب موالی کا ہے اور صحابہ کو چھوڑ کر عربوں کا بالکل ہی برائے نام اور علومِ حکمیہ میں تو سوائے دو تین مشاہیر جیسے الکندی،

[1] ایران بعہدِ ساسانیاں صفحہ ۵۷۰۔ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۳۔

ابن الحائک یا ابن الاعلم وغیرہ کے بعد کے زمانہ میں بھی خالص عربوں کا نام عباقرۂ اسلام کی فہرست میں نظر نہیں آتا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"واما علم الفلاسفة..... لا اعلم احداً من صمیم العرب شهر به الا ابا یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی وابا محمد الحسن الهمدانی۔" اور رہا علمِ فلسفہ..... تو میں خالص عربوں میں سے سوائے ابو یوسف یعقوب بن اسحاق کندی اور ابو محمد حسن ہمدانی کے کسی اور کو نہیں جانتا جو ان علوم میں مشہور ہوا ہو۔ (طبقات الامم ص۷)

علومِ حکمیہ ہی میں نہیں بلکہ علومِ دینیہ اور لسانیات میں بھی اسلامی ثقافت نے جو بیش بہا خدمات انجام دیں، اُن کا فضل و شرف صرف عربوں ہی کو پہونچتا ہے۔

مگر یہی امتیاز اسلامی ثقافت بلکہ خود عظمتِ اسلام کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ جب عربوں نے غیر عرب مسلمانوں پر اپنی نسلی برتری اور تفوق کا اصرار کیا تو مجبوراً اُنہیں اس کا انکار کرنا پڑا اور پھر وہ تحریک شروع ہوئی جو "شعوبیت" کہلاتی ہے، شروع میں یہ صرف ایک فکری تحریک تھی، مگر عہدِ حاضر میں دولِ یورپ کی ہوسِ استعمار نے اسے سیاسی شکل دیدی اور "کانهم بنیان مرصوص" ہونے کے باوجود نبی اُمی کی اُمت پارہ پارہ ہوگئی، حالانکہ رب العزۃ نے "وحدتِ ملی" کو ایک بڑی نعمت فرمایا تھا۔

"واذکروا نعمت الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخواناً" اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو، جب تم میں بیر تھا، اُس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اُس کے فضل سے تم آپس میں بھائی ہوگئے۔ (آل عمران - ۱۰۳)

مگر جب شیطان نے اُنگلی دکھادی تو یہی "اُلفت" نفرت میں بدل گئی اور "ملتِ اسلام" کے بجائے نہ صرف ایرانی و تورانی قومیتیں ظہور میں آگئیں، بلکہ خود عربوں میں بھی ربیعہ و مضر اور عدنانی و قحطانی کی تفریق و تمزیق پیدا ہوگئی فانا لله وانا الیه راجعون۔

بہرحال یہ نہ عربی ثقافت تھی نہ ایرانی نہ تورانی۔ یہ صرف خالص "اسلامی" ثقافت تھی اور صرف "مسلمان" (مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے علمبردار تھے، مگر مسیحی یورپ کو اسلام کی عظمت کا نام لینا ناگوار تھا۔ اس لئے بادلِ ناخواستہ اس نے اس کا نام "عربی ثقافت" رکھا۔ فهل من مدّکر۔